بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک مسلمان جب دعوتِ دین کا پاک اور نیک ارادہ لے کر اُٹھتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کا آغاز کس طرح کرے۔ کیا وہ چھوٹتے ہی پہلے مخاطب کو اپنی ساری بات سنا دے اور پھر اسے اعتراضات کا موقع دے، یا پہلے مخاطب کو اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کو بیان کرنے کی دعوت دے اور پھر آن کی روشنی میں اُس سے تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ دعوتِ دین کے لیے نقطۂ آغاز معلوم کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے دعوت کا کام کرنے والا ہر شخص زندگی میں ایک بار یا چند بار نہیں بلکہ ایک دن میں کئی کئی بار دوچار ہوتا ہے۔ جو لوگ مزدوروں اور کسانوں میں کام کرتے ہیں وہ بھی اس معاملے میں وہی دقت محسوس کرتے ہیں جو علمی کام کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ دعوت کے کسی کارکن کو اس سے مفر نہیں۔ اس کے لیے اگرچہ کوئی لگا بندھا ضابطہ یا طریقہ توسطے نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی کلیہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم آج اس کے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں۔

بعض حضرات کا اس بارے میں یہ خیال ہے کہ جذبہ ہی درحقیقت اس معاملہ میں بہترین رہنما ہے۔ جب ایک شخص کے دل میں کسی نصب العین یا مقصد کے لیے طلب صادق پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جدوجہد کی راہیں خود بخود نکال لیتا ہے۔ اس "جذبِ اندروں" میں یہ قدرت اور طاقت موجود ہے کہ وہ نئے نئے طریقوں کی تخلیق کرے اور اپنے عمل کے نتائج پر غور و فکر کر کے ان میں تغیر و تبدل کرتا چلا جائے۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو جتنی شدید اور گہری ہو گی راستے کی مشکلات اسی تناسب سے آسان ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا اصل ضرورت دعوت کے طریقے

معلوم کرنا نہیں بلکہ دین کے لیے سچا عشق پیدا کرنا ہے۔

ہم دعوتِ دین کے معاملے میں اس بنیادی حقیقت کے خود قائل ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک آئیڈیل کے ساتھ محبت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ہر قسم کے موانع پر خواہ وہ فطری ہوں یا عمرانی، غلبہ پالے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ جذبہ اپنے اندر ایک لازوال طاقت رکھتا ہے، اور جو اسے اپنائے اس کے اندر بھی یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تسخیرِ فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکے اور راہِ طلب و عمل میں آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس بنا پر یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ دعوت کے طریق کا بہترین فیصلہ ایک شخص کا وجدان اور ذوق ہی کر سکتا ہے اور اس معاملے میں ایک لگے بندھے ضابطے یا طریقے کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ کی حکمت سے واقف ہونا اور ان لوگوں کے طریقِ کار سے سبق لینا جو اس سے پہلے یہ کام بہترین طریقے سے کر چکے ہیں، اس وجدان و ذوق کی رہنمائی کے لیے بہت مفید ہے۔ اسی غرض کے لیے ہم آج مختصراً یہ بتائیں گے کہ کسی شخص یا گروہ کے سامنے دعوتِ دین کو ابتداءً پیش کرنے کے لیے کونسا نقطۂ آغاز بالعموم مناسب تر ہوتا ہے۔

آپ اگر اردگرد کی پھیلی ہوئی وسیع دنیا میں آباد انسانوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں ہر شخص مضطرب اور پریشان ہے۔ اگر ایک فرد کو غمِ دوراں ستا رہا ہے تو دوسرا "غمِ جاناں" کے چنگل میں گرفتار ہے۔ اگر ایک شخص معاشی حیثیت سے غیر مطمئن ہے تو دوسرا سیاسی اعتبار سے بے چین۔ اسی طرح اگر ایک فرد کے جسم کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں تو اس کی روح ایک تشنگی سی محسوس کرتی ہے۔ الغرض ہم میں سے ہر فرد کسی نہ کسی لحاظ سے پریشان نظر آتا ہے۔

یہ معاملہ صرف ایک فرد تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی لپیٹ میں بڑے ملک اور بڑی بڑی قومیں تک آ جاتی ہیں۔ دنیا کی کئی اقوام غیر ملکی سامراج کے نیچے پس رہی ہیں اور انہیں یہ فکر لاحق ہے

کہ کسی طرح اس لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ دوسری طرف کئی قومیں اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ کسی طرح ان مظلوموں کو زیادہ سے زیادہ مدت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جائے اور اس دوران میں جس قدر ممکن ہو، ان کا خون نچوڑا جاتا ہے۔ کسی کو ملک گیری کی ہوس کھائے جا رہی ہے اور کسی کے سر پر ایک عالم گیر جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

پھر یہ کشمکش صرف قوموں اور ملکوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ ہر قوم کے اپنے اندر ایک زبردست ہیجان اور خلجان پایا جاتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ اگر ایک قوم کے لوگ ایک طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں تو اس سے عجیب و غریب نوعیت کی پیچیدگیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس کو بدل کر دوسری راہ پر چلتے ہیں تو دوسرے مسائل پریشان کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب معیشت کو آزاد کیا جائے تو اس سے ایک گروہ کے لیے ناجائز استحصال کا میدان ہموار ہوتا ہے۔ بیروزگاری بڑھتی ہے اور طبقاتی تقسیم معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس کے برعکس جب پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے تو انسان کو ایک نہایت ہی جابرانہ نظام کی جکڑبندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں جس میں نہ کسی شخص کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوتی ہے نہ اظہارِ رائے کی آزادی۔ وہ بیچارا اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ نہ صرف معاشی منصوبہ بندی کے تحت زندگی گذارے، بلکہ اپنے جذبات و احساسات، افکار و تصورات کو بھی ایک سکے بندھے پلان کے مطابق ڈھال لے۔ اور اگر اُس میں ڈھل جانے کی یہ صلاحیت موجود نہ ہو تو یا وہ موت کو دعوت دے یا پھر ساری عمر سائبیریا کے برفانی میدانوں میں دُکھ اور مصیبتیں جھیلتا رہے۔

یہ مضطرب کیفیات اور یہ پریشان کُن حالات جن میں سے ہر فرد گزر رہا ہے اور جنھیں وہ نہایت شدّت سے محسوس بھی کرتا ہے، دعوتِ دین کا بڑی آسانی کے ساتھ نقطۂ آغاز بن سکتی ہیں۔ خواہ کوئی شخص سیاسی حالات سے غیر مطمئن ہو یا معاشی احوال سے یا معاشرتی و تمدّنی کیفیات سے، اسے بغیر کسی دقّت کے یہ بات سمجھائی جا سکتی ہے کہ جس چیز پر وہ مضطرب ہے وہ اصل بگاڑ نہیں ہے

بلکہ ایک کلی اور بنیادی بگاڑ کا محض ایک رُخ ہے۔ جب تک تم مجموعی خرابی کو اور اس کے بنیادی سبب کو نہ سمجھ لو، اس کے محض ایک جُزیا چند اجزاء کو بدل دینے میں اوّل تو کامیاب نہیں ہو سکتے اور اگر کامیاب ہو بھی جاؤ تو اس سے وجوہِ اضطراب ختم ہو جانے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس طریقے سے جب آدمی کا ذہن ایک مرتبہ فروعی مظاہر کے الجھاؤ سے نکل کر حقائق کا سراغ لگانے پر آمادہ ہو جائے تو اسے بآسانی اس بنیادی اصلاح کو سمجھنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے جو دینِ حق انسانی زندگی میں کرنا چاہتا ہے اور جس سے زندگی کے ہر شعبے کا بگاڑ درست کیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنی اس بات کو چند مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس وقت ملک کی جو معاشی صورتِ حال ہے اُس سے ایک عام اضطراب ہر طرف برپا ہے یہاں دولت کی تقسیم نہ صرف غیر مساوی ہے بلکہ غیر عادلانہ بھی ہے۔ غریب اور متوسط طبقے اشیاء کی روز افزوں گرانی کی وجہ سے بُری طرح پس رہے ہیں۔ ان کے برعکس ایک قلیل گروہ لائسنسوں اور بلیک مارکیٹ جیسے ناجائز طریقوں سے حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ امیر ہو رہا ہے۔ چونکہ اس طبقہ کو دولت بغیر کسی محنت اور مشقت کے حاصل ہو رہی ہے اس لیے وہ اسے نہایت بے پروائی سے خرچ کرتا ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے اس ملک میں عیش و تنعم کی زندگی کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور اس طرح یہاں فحاشی اور بد معاشی کا بازار گرم ہوا ہے۔ لوگ جب اس مسئلہ کو بادی النظر میں دیکھتے ہیں تو اُن کو یہ مسئلہ صرف معاشی مسئلہ نظر آتا ہے۔ ایک آدمی فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ اس صورتِ حال کو ہم معاشی پالیسی میں تبدیلی کر کے بدل سکتے ہیں۔ مثلاً اس معاملہ میں وہ آپ کو یہ بتائے گا کہ منافعوں پر بڑھتی ہوئی شرح پر ٹیکس عائد کرنے سے، لائسنس اور پرمٹ اور کوٹا سسٹم کو ختم کرنے سے اور اخراجات پر پابندی لگا دینے سے حالات درست ہو سکتے ہیں۔ آئیے! اب یہ دیکھیں کہ کیا حالات کا یہ صحیح تجزیہ ہے۔ مثلاً اگر منافعوں پر ٹیکس کی شرح بڑھا دیتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وصول کرنے والے کارندے ایمان داری سے اُس کو وصول کریں، اور ٹیکس

ادا کرنے والے بغیر کسی ہیر پھیر کا طریقہ اختیار کیے پوری دیانتداری سے یہ ٹیکس دے دیں۔ لائسنس اور کوٹا کا جہاں تک تعلق ہے ہم اس وقت کے حالات کے پیش نظر اسے ختم نہیں کر سکتے۔ نہ ہمارے پاس اس قدر زرِ مبادلہ ہے کہ ہم آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکیں اور نہ آزاد تجارت کے نتائج بھگتنے کی ہم سکت ہی رکھتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اپنی بیرونی تجارت کو محدود رکھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ جن لوگوں پر لائسنسوں اور کوٹوں کی عنایات کی جا رہی ہیں اُن سے یہ عنایات چھین کر یا تو حکومت خود درآمد کرے یا اس کے لیے موزوں لوگوں کو منتخب کرے۔ اب ہمارے پاس اس امر کی کیا گارنٹی ہے کہ اربابِ حکومت یا وہ دوسرے لوگ اس معاملہ میں بڑی دیانتداری سے کام لینگے۔ جہاں تک اخراجات پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہے اس معاملہ میں بھی خارج سے کوئی حد نہیں لگائی جا سکتی۔ عقل بڑی عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے۔ آپ اخراجات کی اگر ایک شکل کو ناجائز قرار دیں گے تو وہ فوراً انھیں دوسری شکل میں ڈھال لے گی۔

ان گزارشات پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ آئین وضوابط کی تبدیلیاں خواہ بڑی اہم ہی سہی لیکن وہ اس وقت تک کوئی قابلِ قدر نتائج پیدا نہیں کر سکتیں جب تک انسان کے زاویہ ہائے فکر و نگاہ کو نہ بدلا جائے۔ اور یہ معاملہ معاشی نہیں بلکہ اخلاقی ہے، یا دوسرے الفاظ میں خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔

اب سوال پیدا ہو گا کہ ہم اخلاق کا وہ کونسا ضابطہ اختیار کریں جس سے صورتِ حال میں کوئی صحت مند تبدیلی پیدا ہو۔ ایک تو اخلاق کی وہ شکل ہے جو یورپ کی قوموں میں نظر آتی ہے۔ اس اخلاق کو ہم "مصلحت پرستانہ قومی اخلاق" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جس طرزِ عمل میں ملک اور قوم کا فائدہ دکھائی دیا اُسے ہی اخلاقی ضابطہ بنا لیا۔ اخلاق کی یہ قسم معروضی اقدار پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ وہ سیمابی اخلاق ہے جس کی قدریں خارجی حالات کے تبدیل ہونے سے ہر آن محوِ رقص رہتی ہیں۔ ممکن ہے اس اخلاق سے ایک گروہ قوم یا ملک کو وقتی طور پر کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن اس سے انسانیت کی سطح بلند نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان کے وہ نام نہاد اخلاق پرست جو حریت اور شرف انسانیت کا پرچار کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے وہ جب ہندوستان پر قابض ہوئے تو یہاں خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ وہ لوگ جو اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت اور پاسبانی کے دعویدار تھے انھوں نے استعماری عزائم کے ساتھ یہاں کے لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ ظاہر بات ہے کہ اخلاق کی اس قسم کو کوئی انسان جسے انسانیت کا ذرا بھی پاس ہے، قبول کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ اُن اخلاقی اقدار کو تسلیم کریگا جو آفاقی ہوں، جو "من و تو" کے ساتھ بدلتی نہ رہیں، جن کے پیچھے پوری نوعِ انسانی کی بلندی کا جذبہ کام کر رہا ہو۔ آپ جب اس معاملہ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ اخلاق اس وقت تک معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ایک انسان کائنات اور اُس کے خالق کے ساتھ اپنے رشتہ کا صحیح صحیح تعین نہ کرلے

اس طرح معاشی مسئلہ سے بات شروع کر کے آپ خود بخود اسلام پر پہنچ جاتے ہیں مخاطب کے اضطراب کی تشخیص کر کے اُسے غور و فکر کی صحیح راہ پر ڈال دیجیے۔ پھر ایک کڑی دوسری کڑی سے ملتی چلی جائے گی اور وہ از خود صحیح نتائج اخذ کرے گا۔

اسی طرح وہ لوگ جو سرمایہ دارانہ جمہوریت سے بد دل ہو کر اشتراکیت کی طرف جھک جاتے ہیں انھیں بھی تھوڑی سی کوشش سے صحیح راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اُن کی دُکھتی رگ کیا ہے۔ آپ جب بھی اُن سے بات کریں وہ یہی کہیں گے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں چونکہ ہر فرد کو ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے اور اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو جس طرح چاہے کام میں لگائے یا خرچ کرے، اس لیے معاشی اعتبار سے طاقتور گروہ مفلوک الحال لوگوں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں لوٹتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فساد کی اصل جڑ ان کے نزدیک دولت اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت ہے، اسی کے حقوق مالکانہ انسان کو ظالم اور سفاک بنا دیتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ ساری

دولت افراد کے قبضے سے نکال کر قومی ملکیت بنادی جائے تو وہ انسان کہاں سے آئیں گے جو اس مجموعی دولت اور اس سے حاصل ہونے والی طاقت کو انصاف کے ساتھ سب کی بھلائی کے کام میں لگائیں اور اتنی بڑی قوت پاکر ظالم و سفاک نہ بن جائیں ؟ اگر ایسے انسان تیار کرنے کی کوئی سبیل ہے تو اس دولت اور طاقت کے افراد کے پاس رہنے سے بھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور اگر اس کی کوئی سبیل نہیں ہے تو افراد سے چھین کر ساری دولت اور طاقت ایک جگہ سمیٹ دینے سے ظلم ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جائے گا، کیونکہ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہی دولت اور طاقت انسان کو ظالم بنادیتی ہے۔ اس طرح پھر پھر کر بات وہیں پہنچ جاتی ہے کہ اصل مسئلہ دولت کی انفرادی یا اجتماعی ملکیت کا نہیں ہے بلکہ انسان کے اندر عدل اور حق شناسی اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کا ہے اور آخری تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس وقت تک صحیح معنوں میں پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کائنات میں انسان اپنے حقیقی مقام، اور ربِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو ٹھیک ٹھیک نہ جان لے۔

غرض آپ زندگی کے کسی پہلو کا تجزیہ کریں، خواہ اس کا تعلق اخلاق و اجتماع سے ہو یا سیاست و آئین سے، یا نظامِ معیشت سے۔ آخر کار اس کے بگاڑ اور سنوار میں جو سوال مرکزی اہمیت کا حامل نکلے گا وہ یہی ہوگا کہ نظامِ زندگی کے کارکن اور کارفرما انسان کیا سمجھ کر اس زندگی کی گاڑی کو چلا رہے ہیں اور ان کے فکر و عمل کی بنیاد کن تصورات پر ہے۔ سوچنے والا ذہن زندگی کے جس مسئلے میں بھی غلطاں و پیچاں ہو، آپ ایک دفعہ اسے صحیح طریقہ سے اس مسئلے کی طرف متوجہ کر دیجیے، پھر وہ اگر متعصب یا ضدی نہیں ہے تو خود اس حقیقت کو پالے گا کہ انسان کے صحیح روش پر چلنے کا انحصار جس چیز پر ہے وہ صرف رب العلمین کے ساتھ اس کے تعلق کا درست ہونا ہے۔

دعوت کے اس طریقے میں متعدد خوبیاں ہیں۔ ایک شخص کے اضطراب اور پریشانی کو جب ہم خود محسوس کرتے ہیں اور اس اضطراب میں اس کے شریکِ حال ہو کر بات کرتے ہیں تو اس سے مخاطب کے

دل میں خود بخود یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ دعوت دینے والا صرف واعظ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے درد میں اس کے ساتھ شریک ہے۔ وہ یونانی دیوتاؤں کی طرح پہاڑوں پر کھڑے ہو کر نوعِ انسانی کے مصائب پر خندہ زن نہیں ہو رہا ہے۔ وہ مافوق البشر نہیں ہے بلکہ اسی طرح کا ایک بشر ہے جیسے اور سب بشر ہیں۔ اسے بھی اسی طرح کے مسائل درپیش ہیں جس طرح کہ ایک عام انسان کو ہر روز پیش آتے ہیں۔ وہ بھی اُن کے بارے میں سوچتا ہے، اُن پر غور و فکر کرتا ہے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک شخص کے بارے میں یہ یقین ہو جائے کہ وہ کسی معاملے میں آپ کا رفیق ہے تو پھر آپ اُس کی بات سننے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک انسان عام طور پر اُن لوگوں سے بھاگتا ہے جو بلندیوں پر بیٹھ کر آپ سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہیں۔ لیکن جب آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ اس کے بھائی ہیں تو پھر اسے نہ صرف آپ کی بات سننے میں کوئی عذر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ ہم اُس شخص کی بات پر کبھی کان نہیں دھرتے جس کے بارے میں ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ وہ ہم سے اور ہمارے احساسات سے بیگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعے نوعِ انسانی میں نہیں پھیلایا بلکہ اس کام کے لیے نوعِ انسانی ہی میں سے چند بزرگ و برتر افراد کو منتخب کیا جو عام انسانوں میں گھل مل کر رہتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہ شخص جو ہمیشہ عالمِ بالا سے باتیں کرے اور انھیں ہر وقت بس دوسری دنیا ہی کی باتیں سناتا رہے، دعوت کے کام کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ اس کی باتوں کو لوگ عقیدت کے کانوں سے بھی سنیں تو یہ احساس فطرۃً ان کے دل سے نہیں نکل سکتا کہ یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں جن کا مقام عام انسانوں سے وراء الورا ہے۔

پھر جب آپ بحیثیت مجموعی اس ماحول کی ظلم و زیادتی کو تسلیم کر لیتے ہیں تو اس سے بھی مخاطب پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ آپ کج بحث نہیں ہیں بلکہ ایک مخلص انسان ہیں جو زندگی کے حقائق سے صرفِ نظر کر کے نہیں چلتا۔ بلکہ اس دنیا اور اُس کے مسائل کو آنکھیں کھول کر

دیکھتا ہے۔آپ کی دعوت صرف الفاظ کی بازیگری نہیں بلکہ اُس کی پُشت پناہی ایک گہرا خلوص اور ذاتی تجربہ کر رہا ہے ۔آپ کا مدعا یہ نہیں کہ ذہنی کشتی میں مدِمقابل کو نیچا دکھا کر اپنی برتری کا لوہا منوایا جائے بلکہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ اُس دکھ درد کا مداوا کرنے کے لیے کچھ کیا جائے جس میں وہ اور آپ اور دوسرے بے شمار انسان گرفتار ہیں ۔ لہٰذا آپ اُس کے مخالف نہیں بلکہ اُس کے ساتھی ہیں۔

جب دعوت کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے داعی کے اندر خود بخود حقیقت پسندی پیدا ہو جاتی ہے ۔وہ پھر خلا میں نہیں سوچتا بلکہ زمان و مکان کی حدبندیوں میں رہ کر حالات و واقعات پر غور کرتا ہے ۔اس کی نگاہیں دُوررس اور اس کا نقطۂ نظر وسیع اور آفاقی ہوتا ہے۔اس لیے اُس کے ذہن میں وہ کشمکش پرورش نہیں پاتی جو عام طور پر ایک تخیّل کی دنیا میں بسنے والے انسان کے دماغ میں حقیقت اور خواہش کی باہمی آویزش کی وجہ سے جنم لیتی ہے ۔وہ صرف نصب العین ہی پر نظر نہیں رکھتا بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے راستے میں جتنے مراحل سے گذرنا ناگزیر ہوتا ہے اُن پر بھی وہ برابر نگاہ رکھتا ہے ۔اس بنا پر اس کے تجزیہ میں زیادہ صحت پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ اس طرزِ عمل سے اُس میں رواداری اور صبر و تحمل کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب اپنے حالات و واقعات کو خواب و خیال کے آئینہ میں نہیں بلکہ حقیقت کی عینک سے دیکھتا ہے تو اُس کے مشاہدہ میں ارضیت اور عصریت کے عناصر پوری طرح شامل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ دوسروں کے نقطۂ نظر پر بھی ہمدردانہ غور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے ۔ وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر برہم ہوتا ہے اور نہ ہی جزئیات پر کفر و ایمان کی بحث اٹھاتا ہے ۔وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آشنا ہوتا ہے کہ حالات کے مطالعہ میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے اور اسے برداشت بھی کرنا چاہیے ۔اس لیے اُسے دشمن کو جہنم بھیجنے

سے کہیں زیادہ فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی اصل پریشانی کو معلوم کرکے اُسے راہِ راست پر لے آئے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر وہ تحریک جو خلوص پر مبنی ہو اور جس میں نوعِ انسانی کے مصائب دُور کرنے کا جذبہ کارفرما ہو، اُس میں صداقت کا کم از کم ایک عنصر ضرور پایا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ صداقت جزوی ہوتی ہے اس لیے ادھوری سچائیوں کی طرح خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ وہ نہایت دیدہ وری سے اپنے مخاطب کو اس جزوی صداقت سے گذار کر صداقتِ کلّی تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں کبھی یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ سرے سے اس جزوی صداقت کے وجود ہی کا انکار کر دے۔ اس کے لیے یہی جزوی صداقت وہ قدرِ مشترک بن جاتی ہے جس سے وہ اپنے مخاطب کو کلّی صداقت تک لے جانے کا کام لیتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دعوتِ دین کا کام مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ اس میں حقیقی اشکال یہ ہے کہ روح اور مادہ کی ثنویت کا جو تصور صدیوں سے انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا ہے، اُسے نکال باہر پھینکنا اور اس کی جگہ دین اور دنیا کی یکجائی کا عقیدہ ذہن نشین کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک مذہبی آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ امورِ دنیا روحانی اور اخلاقی ترقی کا زینہ بن سکتے ہیں۔ اور ایک دنیا دار آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا کہ امورِ دنیا کو مذہب کے تابع کرنے ہی میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر ہے، بہت کٹھن اور مشکل مرحلہ ہے۔

یہ بھی حالات کی عجیب ستم ظریفی اور انسانی فطرت کی نرالی کرشمہ سازی ہے کہ جس چیز کو آج کا انسان عقیدہ کی شکل میں ماننے کے لیے مشکل ہی سے رضامند ہوتا ہے، اسے عمل کی دنیا میں وہ برابر اپنا رہا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی منکرِ مذہب انسان ایسا ہو جو اپنے روزمرہ کے دنیاوی مسائل میں اپنا ایک اخلاقی ضابطہ نہ رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح دنیا کا ہر مذہبی آدمی کسی نہ کسی حد تک "دنیادار" بننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس دنیا میں مذہب اور مادیت فلسفہ کی حد تک تو بلاشبہ دو مختلف کارخانے شمار کیے جاسکتے ہیں لیکن جب ہم ایک عام انسان کی عملی زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہم اس

نظریہ کو بالکل باطل پاتے ہیں۔ ہمارا تجربہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کو روح اور مادہ کی ثنویت میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کُل کو اگر اجزاء میں بانٹا جائے تو اس کی اصلی حقیقت بالکل مسخ ہو جائے گی۔ ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی عقیدہ یا خیال کا ہو اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی اور معنوی نقطۂ نظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ایک دن بھی نہیں گذر سکتا۔ یہ چیز انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس کے دل کی ایک جذباتی پکار ہے۔ لیکن اسی بات کو جب آج کل کے عام انسان کے سامنے رکھو اور اسے دعوت دو کہ اپنی زندگی کے روحانی، اخلاقی اور مادی پہلوؤں کے لیے ایک نظام اختیار کرے، تو وہ اس تخیل سے اپرائیگا اور رہ رہ کر اس بات پر اصرار کرنے لگے گا کہ مذہب کو دنیوی معاملات سے الگ رکھو۔ عام انسان ہی نہیں، خود اہلِ مذہب میں سے بکثرت لوگ دین و دنیا کی اس یکجائی کو ماننے سے عملاً انکار کریں گے۔ خواہ نظری طور پر وہ اس کے قائل ہی کیوں نہ ہوں۔

اس مشکل کے باوجود دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہی چیز آسانی کا موجب بھی ہے کہ دین و دنیا کی علیحدگی حقیقت میں انسان اور کائنات کی فطرت کے خلاف ہے، اور جیسا کہ ابھی اوپر ہم نے عرض کیا، انسان ان کو الگ کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود انھیں واقعتہً الگ کر دینے پر قادر نہیں ہیں۔ انسانی فطرت خود ایک ایسا نظام چاہتی ہے جو دین کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو دین کے ساتھ سمو دے اور ان کے باہمی تضاد کو ختم کر دے۔ اسلام چونکہ ایسا ہی ایک نظام ہے اس لیے وہ انسانی فطرت سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اسے پیش کرنا اور لوگوں کے دل و دماغ کو اس پر مطمئن کرنا دنیا لازماً ان دوسرے مسلکوں کی دعوت کے مقابلہ میں آسان ہی ہونا چاہیے جو یا تو انسان کی روحانی پیاس کو بجھانا چاہتے ہیں مگر اس کی مادی مشکلات حل نہیں کرتے، یا مادی مشکلات حل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کی روح کو پیاسا رکھتے ہیں۔

ممکن ہے یہاں پہنچ کر ایک انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر عملاً دنیا کے سب انسان

(خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیادار) اپنی زندگی میں مادّی اور روحانی و اخلاقی پہلوؤں کو کچھ نہ کچھ سموتے ہی ہیں، اور اسلام بھی ان کو سمونے کا کام ہی کرتا ہے تو پھر اسلام کا امتیاز کس چیز میں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے: اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے مسائل زندگی کے جو حل پیش کیے ہیں وہ بیشتر امتزاجی نوعیت کے ہیں، لیکن اس نے اس امتزاج میں مختلف افکار و اعمال کے درمیان جو نسبتیں قائم کی ہیں وہ خالصتاً اُس کی اپنی ہیں۔ اور یہی اُس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آپ زندگی میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں سے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر چہرے کو دوسرے سے مختلف پاتے ہیں، حالانکہ اعضاء کے اعتبار سے وہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اعضاء کا نہیں بلکہ اُس تناسب کا ہے جو ان اعضاء کے درمیان موجود ہوتا ہے اور یہی چیز ایک چہرے کو دوسرے سے ممیّز کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام دوسرے مذاہب ادیان اور مسالکِ زندگی یا تحریکات سے بالخصوص جس چیز میں مختلف ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے بیشتر شعبوں کے درمیان نسبتوں کا جو رشتہ قائم کیا ہے وہ خالصتہً اس کا اپنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی اقدار حیات دوسروں سے بالکل مختلف ہیں اور اسی چیز میں اُس کی انفرادیت منعکس ہوتی ہے۔ ان حالات میں ایک داعی کا کام صرف اسی قدر ہے کہ باطل نظریات نے خالق و مخلوق کے درمیان نسبتوں کے جو غلط تعلقات قائم کر رکھے ہیں انہیں بدل کر صحیح بنیادوں پر اُستوار کرے۔ اگر بندے اور اس کے رب کے تعلقات کی نوعیت درست ہو جائے تو اس سے نہ صرف آخرت سنور جاتی ہے بلکہ اس دنیا کی زندگی سے بھی فساد مٹ جاتا ہے اور یہاں امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں متعدد مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ زندگی سے اختلال اُسی وقت دُور ہو سکتا ہے جب انسانوں کا اپنے خالق کے ساتھ رشتہ درست ہو۔ جب تک اس رشتہ کو صحیح نہیں کیا جائیگا اس وقت تک زندگی سے بُرائی کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ جب حضرت

لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک عادت بد سے باز رہنے کی دعوت دی تو سب سے پہلے انھیں اس بات کی نصیحت کی کہ تم اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ کے خوف کے مٹ جانے سے ہی فسق و فجور کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطِنِ الْمُرْسَلِينَ ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۔ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۝ (الشعراء۔ ۸)

قوم لوط نے پیغام لانے والوں کو جھٹلایا۔ جب اُن کے بھائی لوط نے اُن سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمھارے لیے پیغام لانے والا امین ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ میں تم سے اس کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر پروردگارِ عالم کے پاس ہے۔ کیا تم جہان کے مردوں کے پاس جاتے ہو اور ان بیویوں کو چھوڑ دیتے ہو، جو تمھارے رب نے تمھارے لیے پیدا کی ہیں؟ بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو۔

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو لین دین میں دیانتداری کا سبق دینے سے پیشتر اُسے یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تمھارا اپنے خدا سے تعلق صحیح ہونا چاہیے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۔ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ وَاتَّقُوا

بن کے رہنے والوں نے پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب انھیں شعیب نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھاری طرف ایک با امانت پیغمبر آیا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں تم سے اس کا کچھ اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر پروردگارِ عالم کے پاس ہے۔ تم سیدھی ترازو سے تولو اور لوگوں کی چیزیں کم مت کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کی حیثیت سے نہ پھرو۔ اور اس ذات سے ڈرو جس نے

الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ۝ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ وَمَا أَنتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِن نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ۝

تمھیں بھی پیدا کیا اور خلقتِ اوّل کو بھی۔ وہ بولے تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور تم بھی ہماری طرح کے انسان ہو اور ہمارے خیال میں تو تم جھوٹے ہو۔

اسی قسم کی بے شمار آیات ہمیں قرآنِ حکیم میں ملتی ہیں جن میں اس بنیادی حقیقت کی طرف نہایت واضح الفاظ میں رہنمائی کی گئی ہے کہ اُس وقت تک اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان اُن نسبتوں کو درست نہ کرے جو خدا اور انسان کے درمیان اور انسان اور اِس کائنات کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے نجاشی کے دربار میں دعوتِ دین کے لیے جو فصیح و بلیغ تقریر ارشاد فرمائی وہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اس تقریر کے دو حصے ہیں۔ ایک میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جب ہمارے خالق کے ساتھ تعلق کی نوعیت صحیح نہ تھی تو ہم میں کون کون سی بُرائیاں پائی جاتی تھیں، اس کے بعد جب ہمیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں خداوند تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کرنے کی توفیق حاصل ہوئی تو پھر ہماری زندگی کے سارے گوشوں میں ـــــ خواہ ان کا تعلق امورِ دنیا سے تھا یا امورِ آخرت سے ـــــ ایک خوشگوار انقلاب آیا۔ انھوں نے فرمایا:

"اے بادشاہ! ہماری قوم کی یہ حالت تھی کہ ہم سب جاہل تھے، بتوں کی پرستش کرتے، مُردار کھاتے، بُرے کاموں کے مرتکب ہوتے۔ رشتے ناتے توڑ دیتے، پڑوسیوں سے بُرا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے قوی کمزور کو کھا جاتے۔ ہماری زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جانب ہمیں میں سے ایک شخص کو رسُول بنا کر بھیجا۔ جس کے نسب، سچائی، امانت اور پاک دامنی کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو یکتا مانیں اور اُسی کی عبادت کریں۔ ہم اور ہمارے بزرگوں نے اس کو چھوڑ کر پتھروں اور

بتوں کی جو پرستش شروع کر رکھی تھی اس کو ترک کر دیں۔ اس رسول نے ہمیں صداقت۔ امانت۔ صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک، حرام باتوں اور قتل و خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا اور ہمیں بری باتیں، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اُس نے ہمیں حکم دیا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزوں کا حکم دیا۔ ہم نے اس ذات کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لے آئے[1]"

یہ تقریر اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جب خدا کے ساتھ بندے کا تعلق درست نہ ہو تو اس سے نہ صرف اس کی روحانی زندگی میں، بلکہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، لیکن جب اس تعلق کو صحیح کر دیا جائے تو اس سے پوری زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت اور روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے بلکہ معاشرت میں حسن سلوک، تمدن میں توازن، اور معیشت میں عدل و مواساۃ کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کرے تو کندن بن جائے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۵۸